R. No. 2186/...

Regd. No. A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 55

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۰ - شمارہ ۱۶	ایڈیٹر آل احمد سرور	علی گڑھ - ۲۲ اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

سید شہاب الدین دسنوی

دیسنہ لائبریری مرحوم

۱۰ جولائی ۱۹۶۰ء کی تاریخ تھی اور اتوار کا دن ۔ دس بجے کے قریب یکایک گڑگڑاہٹ کی آواز آئی ، تھوڑی دیر میں دیسنہ لائبریری کی عمارت کے سامنے قبرستان کی زمین پر چند بیل گاڑیاں آکر کھڑی ہوگئیں ۔ آس پاس کے بچے بوڑھے جمع ہوگئے ، ہر شخص پوچھ رہا تھا ، کیا بات ہے ؟ گاڑیاں کہاں سے آئی ہیں ؟ کیوں آئی ہیں ؟ اتنے میں کتب خانے کے ناظم مولوی سید عبدالحفیظ صاحب آگئے ۔ انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کتب خانے کا قفل کھولا ۔ الماریوں سے کتابیں نکالی جانے لگیں ۔ کل سات ہزار ایک سو چودہ کتابیں جن کو صندوق میں بھری گئیں اور صندوق گاڑیوں پر لادے گئے ۔ گڑگڑاہٹ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی اور گاڑیاں روانہ ہوگئیں ۔ لوگوں نے سنا کہ ریاست بہار کے گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ایما سے کچھ لاریاں دیسنہ لائبریری کی کتابیں پٹنہ منتقل کرنے کے لئے آئی تھیں لیکن بارش کی وجہ سے راستہ خراب ہوگیا تھا اس لئے لاریاں ایک میل کے فاصلے پر ، استھانواں میں روک دی گئی تھیں اور بیل گاڑیوں کے ذریعے دیسنہ سے استھانواں تک کتابیں پہنچائی جارہی تھیں ۔ انھیں لوگوں نے یہ بھی سنا کہ اب یہ کتابیں پٹنہ کی خدا بخش خاں لائبریری (اورینٹل پبلک لائبریری) میں بڑی خوبصورت شیشے والی آہنی الماریوں میں ، رکھی جائیں گی ۔ ان کی دیکھ بھال باقاعدہ سرکاری اخراجات سے ہوا کرے گی ۔ اس حصے کا نام "دیسنہ لائبریری سیکشن" ہوگا ۔ اور اس طرح جس کتب خانے کا فیض دوری اور رسل و رسائل کی بعض دقتوں کی وجہ سے بڑی حد تک محدود تھا اب عام ہو جائے گا تقسیم ہند سے پیدا شدہ

حالات کے تحت جس ذخیرے کو سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا اور خطرہ تھا کہ کہیں ضائع نہ ہو جائے ، اب حکومت کی نگرانی میں محفوظ ہو جائے گا یہ سب باتیں معقول تھیں ، خوش کُن تھیں لیکن اس واقعہ کا جو اثر اہل دیسنہ کے دلوں پر ہوا اسے دائرۂ تحریر میں لانا آسان کام نہیں ہے ۔ جن مٹھی بھر باشندگان دیسنہ نے بیل گاڑیوں کو رخصت کیا وہ جذبات کا کیسا بے پناہ طوفان دبائے ، لبوں پر مہر سکوت لگائے حیران و ششدر دیکھ رہے تھے اور آنسو بہا رہے تھے ۔ آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں اس پر یقین کرنے کو دل [illegible] ہوتا تھا ۔ اُن کے سامنے ہی پر وقار اور پُرسکون قبریں تھیں جن میں ان کے اسلاف دفن تھے ۔ ان قبروں میں کیسا نالۂ خاموش اُٹھا ہوگا ! روحیں کس طرح تڑپی ہوں گی ! ــــــ کون جان سکتا ہے !

اہل دیسنہ کو اپنے کتب خانے کے گنج گرانمایہ کو جدا کرنے کا جتنا صدمہ ہوا اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ۔ ان کے لئے یہ کتب خانہ کہاں تھا ۔ اسے تو وہ اپنے خون جگر سے سینچی ہوئی کشتِ آرزو سمجھتے تھے ۔ یہ تو ان کی تمناؤں کا شجر بار آور ، ان کی محنتوں کا ثمرہ ، اُن کی روایات کا سرچشمہ ، ان کی ثقافت کا مرکز ، ایک گراں قدر ورثہ اور نہ جانے اور کیا کیا تھا ۔

ایک چھوٹے سے قریہ میں ، جس کی چھوٹی آبادی ہزار بارہ سو نفوس پر مشتمل رہی ہو ، جہاں سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن بھی سات میل کی دوری پر ہو ، اتنے بڑے ادبی خزانے کا اکٹھا ہو جانا یقیناً باعث استعجاب ہے ۔ مولوی عبدالحق کی جہاندیدہ آنکھوں نے اسے دیکھا تو انھیں "حقیقی مسرت" ہوئی اور انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ "اردو کتب اور رسالوں کا ایسا اچھا اور جامع مجموعہ شاید کہیں اور ہو" ۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اسے "نادر مجموعۂ علم" کہا ۔ آچاریہ کرپلانی کو "دیکھ کر اچنبھا ہوا کہ دیہات میں اتنی بڑی دو ٹیکل لائبریری کیسے اکٹھی ہو گئی" ۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے

اس کے علمی مطالعات اور منتخب کتابوں کے مجموعے کے پیش نظر ارشاد فرمایا "یہ ہندوستان کی مایہ ناز لائبریری ہے۔" ڈاکٹر سید محمود نے اعتراف کیا "غالباً اُردو کا یہ بہترین کتب خانہ ہے۔ میں نے اُردو کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ کہیں اور نہیں دیکھا۔"[1]

ان دوسرے اکابر نے کتب خانہ کا معائنہ کر کے اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار فرمایا ان میں مولانا شفیع داؤدی، مولانا شوکت علی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا مسعود عالم ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، بابو راجندر پرشاد وغیرہ کے نام لائق ذکر ہیں۔

کتب خانے میں وقتاً فوقتاً ترقی اور توسیع ہوتی رہی۔ ایک بار لوگوں نے آپس میں چندہ کر کے اس کی عمارت بنوانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ امام باڑے کی زمین پر دیواریں چھت کے لئے اونچی ہو چلی تھیں کہ غیر معمولی بارش نے ان کو منہدم کر دیا۔ مگر کچھ برسوں کے بعد ہی ۱۹۲۶ء میں ایک نئی پختہ اور خوبصورت عمارت تیار ہو گئی جس میں تقریباً دس ہزار کتابیں جمع ہو گئیں۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس کتب خانے کو نہ کبھی کسی رئیس کی سرپرستی حاصل ہوئی، نہ نواب کی، نہ تاجر کی، نہ کسی جاگیردار کی۔ فنڈ جمع کرنے کے لئے نہ کبھی باہر والوں کے سامنے دستِ سوال دراز کیا گیا اور نہ وہ صورتیں اختیار کی گئیں جو عام طور سے ایسے کاموں کے لئے کی جاتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے مدد ملی بھی تو معمولی سی۔ جہاں تک کتابوں کی فراہمی اور ان کے تحفظ کے طریقۂ کار کا تعلق ہے، یہ ایک بڑی دلچسپ داستان ہے۔ اس داستان کے اکثر کردار اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ابھی چند بہ قید حیات ہیں (اللہ ان کی عمریں دراز کرے!) اصل داستان تو اُن کی زبانی ہی سننے کے قابل ہوتی لیکن اب ان کے دلوں میں اتنی قوت کہاں سے ہوگی کہ وہ یہ غمناک فسانہ سنا سکیں۔ انھیں کرداروں میں ایک مولوی بشیر الحق بیدل ہیں۔

مولوی بشیر الحق بیدل دسنوی عظیم آبادی نے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ملازمت کی تو محکمۂ پولیس میں داروغائی کی۔ اس غیر شاعرانہ پیشے کی بدولت انھیں شہروں سے دور، اکثر ایسے گاؤں اور علاقوں میں رہنا پڑا جہاں لوگ غالب اور شبلی کے نام تک سے بھی واقف نہ تھے۔ پھر بھی ان کے شوقِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ اُردو کی کوئی ایسی قابل لحاظ کتاب نہ ہوتی جو ان کی نظروں سے نہ گزرتی ہو۔ نتیجے کے طور پر انکی نگاہ اتنی عمیق ہو گئی کہ اچھے خاصے محقق بھی ان کے سامنے کتابوں پر باتیں کرتے ہوئے گھبراتے۔ دیسنہ لائبریری کے بہت سے گوشے اسی جوہر شناس کی نگاہِ انتخاب کی رہین منت ہیں۔

ہماری عمر پڑھتے گذری۔ وظیفہ ہوا تو پٹنہ پہنچے اور یہیں اپنے کلبۂ احزان میں مطالعہ کے سرمائے کو کھنگالنے لگے۔ "ہماری زبان" میں وقتاً فوقتاً تحقیقی نوٹ لکھنے لگے۔ پھر "باقیات اقبال" اور "اصلاحات اقبال" دو مختصر کتابیں شائع کیں۔ حالات سازگار ہوتے تو شاید ان کے دامنِ تحقیق سے کچھ اور نوادر بھی چھلک پڑتے۔

کتب خانے کے سلسلے میں دوسرا نام پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا آتا ہے۔ طالب علمی کے زمانۂ قیام کے دوران نجیب اشرف صاحب کلکتہ کی وہ سڑکیں چھانا کرتے تھے جہاں قیمتی جواہر پارے کوڑیوں کے مول بکتے تھے۔ شرط صاحب نظر کی تھی۔ اور ان کے صاحب نظر ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا تھا! مشہور خطاط سلطان مشہدی کا لکھا ہوا عمر خیام کی رباعیات کا نسخہ جو دنیا کا اوّلین مصور نسخہ بھی ہے، نجیب صاحب نے کلکتہ کے فٹ پاتھ پر کتابوں کے ایک ڈھیر سے نکال کر اپنے لئے خریدا۔ فورٹ ولیم کالج کی بیسیوں مطبوعات اور بہت سی دوسری کتابیں انھوں نے دیسنہ کے کتب خانے کے لئے یہیں سے حاصل کیں۔

دیسنہ لائبریری کا ذکر ہوتا ہو اور سید عبدالحکیم کا نام نہ آئے، ویسی ہی بات ہوگی جیسے مسلم یونیورسٹی کا تذکرہ کیا جا رہا ہو اور سرسید کا نام نہ آئے، جامعہ ملیہ کا تذکرہ ہو اور ذاکر صاحب کا نام نہ لیا جائے۔

مرحوم سید عبدالحکیم: مولانا شبلی کے ہم عصروں کے لئے "ابوالکمال سید عبدالحکیم دیسنوی" تھے۔ الپنچ، پٹنہ کے قارئین کے لئے "نام کے حکیم" اور اپنے ہم وطنوں کے "حکیم چچا" یا "حکیم بھائی" تھے لیکن دیسنہ لائبریری کے لئے وہ کیا تھے، اس کا جواب کون دے اور کیا دے؟ سوال تو یوں ہونا چاہیئے کہ وہ اس کے کیا نہیں تھے! وہ لائبریرین بھی تھے، ناظم بھی، مشیر بھی تھے، نگراں بھی، سرپرست بھی تھے۔ کلرک بھی، سکریٹری بھی تھے، فراش بھی۔ دو سال ہوئے ان کا انتقال ہوا تو ان کے ایک بڑے عزیز ساتھی (جو خود مفلوج ہو کر صاحبِ فراش تھے) بڑے درد کے ساتھ پکار اُٹھے لوگو ع:

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے! کتنی صحیح بات تھی!

ہم نے اس کتب خانے میں کتابوں کی فراہمی کی داستان شروع کی تھی۔ کتابیں خریدنے اور عطیہ جمع کرنے کا دستور تو عام ہے۔ اس لئے اہالیان دیسنہ سے بھی عطیے کی صورت میں کتابیں حاصل ہوتی تھیں مگر یہاں ایک اور طریقہ کتابوں کی "وصولی" کا بھی تھا۔ لائبریری کا نہ کبھی کوئی فنڈ رہا نہ بجٹ بنا۔ نہ کوئی سالانہ گرانٹ تھی اور نہ مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ۔ اس کے باوجود اُردو کی جب کبھی کوئی اچھی کتاب چھپتی (خواہ وہ کسی قیمت کی رہی ہو) تھوڑے دنوں ہی میں لائبریری میں نظر آنے لگتی، اور دل چسپ بات یہ تھی کہ (باقی صفحہ ۱۱ پر)

---

[1] اوپر میں درج شدہ الفاظ کتب خانے کی وزیٹر بک (کتاب المعائنہ) سے ماخوذ ہیں۔

[*] ڈائرکٹر انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

ہماری زبان

۲۲ر اپریل ۱۹۶۱ء

قومی وحدت اور لسانی اقلیتیں

مہاراشٹر، پنجاب اور آسام کے واقعات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ لسانی اختلافات سے علاقائی وحدت کو سخت خطرہ ہے۔ جبل پور میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوا اس کی وجہ سے تمام محبان وطن کو بڑا دکھ پہنچا ہے اور ایسے فسادات سے ملک قوم کی جو بدنامی ہوتی ہے یا ان کی وجہ سے جمہوریت غیر مذہبی ریاست اور منصوبے کے مطابق چلنے والے سماج پر جو ضرب لگتی ہے اُس کا احساس تمام سنجیدہ اور مخلص حضرات کو ہو رہا ہے۔ فرقہ واریت سے یہاں براہ راست بحث نہیں اس کی روک تھام کے لئے جو بھی ذرائع مناسب ہوں ہم ان کی حمایت کریں گے، لیکن لسانی اختلافات صرف زبان کی محبت میں ہی نہیں ہوتے، ان کے پیچھے کچھ نہ کچھ فرقہ واریت کی لہر بھی ہوتی ہے۔ مثلاً پنجاب میں ہندی اور پنجابی کا سوال، ہندو اور سکھ کا سوال بتایا جاتا ہے۔ ہندی کو ہندوؤں سے اور اُردو کو مسلمانوں سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ انگریزی عیسائیوں کے سر تھوپ دی جاتی ہے۔ جس شخص میں ذرا بھی شعور ہے وہ جانتا ہے کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور یہ بالکل اتفاقی امر ہوتا ہے کہ کسی زبان کے ماننے والوں میں کسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہو۔ مثلاً پنجابی پنجاب کے ہندو اور سکھ سبھی بولتے ہیں، مگر وہاں کے ہندو اگر پنجابی کو اس لئے چھوڑ دیں کہ سکھ اسے اپناتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے۔ اسی طرح یو۔پی، بہار، دہلی اور پنجاب میں اُردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے اور ان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے تو اس کے یہ معنی کیسے ہوئے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندوؤں کو اسے ترک کر دینا چاہئے۔ پھر ہندی صرف ہندوؤں کی زبان کیسے ہو گئی اور اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ چند ریاستوں کی اکثریت جو ہندوؤں پر مشتمل ہے، ہندی بولتی ہے۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں ہندو، دوسری ریاستوں میں بھی ہیں اور ان کی الگ الگ مادری زبانیں ہیں، پھر بھی فرقہ واریت جب براہ راست اپنا عمل دخل نہیں کر سکتی تو زبانوں کی اشاعت اور ترویج کے بہانے دلوں کی دنیا میں قدم جماتی ہے۔ ایک زمانے میں مسلم فرقہ پرست اُردو کے ساتھ ناانصافی کا بہانہ کر کے اپنے دل کا بخار نکالا کرتے تھے۔ یہ جذبہ اب کمزور پڑ گیا ہے، مگر ہندو فرقہ پرستی ابھی تک کبھی ہندی کی حمایت کے بہانے، کبھی چند فرقہ پرست مسلمانوں کی کوتاہیوں کا نام لے کر، اُردو کی مخالفت کرتی رہی ہے۔ فرقہ پرستی ہندو کی ہو یا مسلمان کی یا سکھ کی، ہر حال میں بری ہے، اس سے قوم کی ترقی رُکتی ہے، اس کی طاقت کم ہوتی ہے، اس کی الجھنیں بڑھتی ہیں، مگر ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ لسانی اقلیتوں کے ساتھ جو بے انصافی چند زبانوں کی حمایت کے بہانے سے، مگر اندر اندر فرقہ پرستی کے جذبے سے متاثر ہو کر ہو رہی ہے، اسے روکیں اور قومی وحدت پر اس طرح جو ضرب پڑتی ہے، اس کا توڑ کریں۔ ہمارے خیال میں اسی لئے لسانی اقلیتوں کا آسودہ اور مطمئن ہونا ہر لحاظ سے ضروری ہے۔ اوّل تو کوئی بھی ملکی زبان ترقی کرے اس میں ملک کا فائدہ ہے، دوسرے اگر کسی زبان کی ترقی کے لئے راہیں کھول کر، ہم کسی جماعت کو مطمئن کرتے ہیں تو اس سے ملک مضبوط ہوتا ہے اور سماج کی ذہنی صحت قائم رہتی ہے۔ تیسرے یہ فرقہ واریت کا بھی علاج ہے جو ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

ایک طرف لسانی اقلیتوں کا فرض ہے کہ وہ قومی نقطۂ نظر سے اپنے علاقے کی اکثریت کی زبان سیکھیں اور اس کی مخالفت نہ کریں، دوسری طرف ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بے خوف ہو کر اپنی زبان کے لئے ملک قوم سے ایسی سہولتوں کا مطالبہ کریں جن کے بغیر ان کے قومی زندگی میں پچھڑ جانے کا خطرہ ہے، تیسری طرف وہ اپنی زبان کی حفاظت کی تحریک کو قومی نقطۂ نظر سے چلائیں، اور ان فرقہ وارانہ عناصر کو قریب نہ آنے دیں جو زبان کی حمایت کے نام پر اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک غلطی دوسری غلطی کا جواز نہیں ہوا کرتی اس لئے اگر کسی زبان کا حامی فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے بات کرتا ہے تو دوسری زبان والوں کو اس کی ضد میں اپنی ناک نہیں کٹوانی چاہئے۔

اُردو بولنے والے ملک کی سب سے بڑی لسانی اقلیت ہیں۔ اس لئے ان کی ذمّہ داری بھی زیادہ ہے۔ انھیں قومی نقطۂ نظر سے اپنی زبان کے ساتھ انصاف کے لئے آواز بلند کرنا ہے۔ انھیں اس کا خیال رکھنا ہے کہ ان کی تحریک میں فرقہ وارانہ عناصر داخل نہ ہونے پائیں۔ انھیں حکومت سے برابر مطالبہ کرتے رہنا ہے جب تک کہ ان کے ساتھ انصاف نہ ہو جائے۔ انھیں اکثریت کو قائل کرنا اور اس کے شبہات کو دور کرنا ہے اور علاقائی زبانوں سے اور قریب ہونا ہے۔ مگر صرف اُردو دوست سب کچھ نہیں کر سکتے۔ حکومت، اکثریت اور علاقائی زبانوں کے حامیوں کو بھی قومی نقطۂ نظر سے، اُردو کا حق دینا ہے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ فرض سب کو ادا کرنا چاہئے۔ پھر حقوق بھی سب کو مل ہی جائیں گے۔

اِدھر اُدھر سے

آندھرا میں جشن ٹیگور

آندھرا پردیش میں ٹیگور کی صدسالہ تقاریب کے دوران میں شہر حیدر آباد میں "رابندرا بھارتی" نیشنل اوپن ایر تھیٹر اور ریاست کے دیگر مقامات پر آرٹ اور کلچر سے تعلق رکھنے والے دیگر اداروں کا افتتاح عمل میں آئے گا۔ نیشنل اوپن ایر تھیٹر ۲۵ لاکھ روپے کے مصارف سے تعمیر کیا جارہا ہے۔ ریاست میں صدسالہ تقاریب کا آغاز ٹیگور کی برسی کے دن ۷ اگست سے ہوگا۔ البتہ حیدر آباد میں یہ تقاریب مئی کے دوسرے ہفتہ سے شروع ہوں گی۔ ریاستی تقاریب کمیٹی نے جو پروگرام بنایا ہے اس کے تحت نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن حیدر آباد میں ۱۱ مئی کو ان تقاریب کا افتتاح کریں گے۔ رابندر بھارتی کا بھی اسی وقت افتتاح عمل میں آئے گا۔ مرکزی وزیر کلچرل امور ہمایوں کبیر اس تقریب کی صدارت کریں گے۔ چیف منسٹر مسٹر ڈی سنجیویا صدر مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے مہمانوں کا خیر مقدم کریں گے۔ مجلس استقبالیہ نے اس موقع کے لئے ڈرامہ، رقص اور موسیقی کا دوروزہ پروگرام بنایا ہے۔ ڈاکٹر بی گوپال ریڈی مرکزی وزیر تعمیرات و اکمنہ دوسرے دن کی تقاریب کی صدارت کریں گے۔ ریاستی حکومت نے ایک اسپیشل افسر کا تقرر کیا ہے، تاکہ اضلاع کا دورہ کرکے ان تقاریب کی تیاریوں میں مدد دے۔ اضلاع کے کلکٹروں نے اضلاع میں یہ تقاریب منانے کے لئے سرکاری حکام اور عوامی نمائندوں پر مشتمل کمیٹیاں تشکیل دی ہیں۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی اس موقع پر ٹیگور کی بعض تصانیف کا تلگو ترجمہ شائع کرے گی۔ آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد ۸ مئی کو ایک خصوصی پروگرام ریلے کرے گا۔ ان تقاریب کے دوران میں ٹیگور کے ڈرامے پیش کرنے میں فن کاروں کو مدد دینے کے لئے بنگال کے فنکاروں کو طلب کیا گیا ہے۔ حیدر آباد کے علاوہ اضلاع گنٹور اور نیلور کے مستقر پر بھی اوپن ایر تھیٹر تعمیر کئے جائیں گے۔ بلدیہ وجے واڑہ بھی ایک مرکزی کتب خانہ تعمیر کرنے پر غور کر رہی ہے۔ نظامس چیریٹی ٹرسٹ کے ۵ لاکھ روپے کے عطیئے سے جامعہ عثمانیہ میں ایک شاندار یادگار تعمیر کی جائے گی۔

حکومت پنجاب کے ادبی انعامات

مشرقی پنجاب کی حکومت نے اُردو کے دو ادیبوں کو گیارہ گیارہ سو روپے کے انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلے یہ انعامات صرف پنجابی اور ہندی ادیبوں کو دئے جاتے تھے۔ اس سال کا انعام حضرت جوش ملسیانی کو دیا جارہا ہے۔ دوسرا انعام آئندہ سال مشرقی پنجاب کے بزرگ شاعر پنڈت میلارام وفا کو دیا جائے گا۔

ہندوستان کے فارسی شعراء

حال میں آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے منعقدہ فارسی شاعری کے مقابلے میں کامیاب ہونے والے شاعروں کو ایران کے وزیر تعلیم ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے انعامات تقسیم کئے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ فارسی شاعری اور شعراء کو اس ملک میں ہمیشہ پناہ تحفظ اور حوصلہ افزائی نصیب ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ایران کے مقابلے میں برصغیر پاکستان و ہند میں فارسی زبان کی کتابیں زیادہ شائع ہوئی ہیں۔ صرف کشمیر میں فارسی زبان کے ہندو اور مسلمان شاعروں کی تعداد مشہور ایرانی شعراء کی تعداد سے زیادہ ہوگی۔

دنیا میں زیادہ بولی جانے والی زبانیں

جارج واشنگٹن یونی ورسٹی (واشنگٹن) کے ماہرین لسانیات نے دنیا کی مختلف زبانوں کی درجہ بندی کی ہے۔ ان کی تحقیقات کے مطابق دنیا میں تین ہزار سے چھ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:-

چینی	۴۶ کروڑ	جاپانی	۹½ کروڑ
انگریزی	۲۵ "	عربی	۸ "
اُردو	۱۶ "	بنگلہ	۷½ "
اسپینی	۱۴ "	پرتگالی	۷½ "
روسی	۱۳ "	فرانسیسی	۶½ "
جرمنی	۱۰ "	اطالوی	۵½ "

"گورا" تاجیک زبان میں

ٹیگور کے مشہور ناول "گورا" کا تاجیک زبان میں ترجمہ ہوگیا ہے۔ یہ ترجمہ ٹیگور کی صدسالہ سالگرہ کے موقع پر شائع کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ جدید تاجیک ادب کے معمار صدرالدین عینی کی دختر خالدہ عینی نے کیا ہے۔ خالدہ عینی نے اس کے بارے میں ایک بیان میں کہا کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں ہندوستان کے عظیم مصنف کی زبان اور تخیلات کو تاجیک زبان میں پیش کرنے میں کامیاب رہی۔ گذشتہ دس سال سے تاجکستان میں رابندر ناتھ ٹیگور کی کتابیں بڑی مقبول ہیں۔

کولرج کے لئے نیا مقبرہ

مشہور انگریزی شاعر سیموئل ٹیلر کولرج (۱۷۷۲ء – ۱۸۳۴ء) کا تابوت ایک شاندار مقبرے میں منتقل کیا جائیگا۔ نیا مقبرہ سینٹ مائیکلز چرچ ہائی گیٹ (لندن) میں تعمیر کیا گیا ہے۔

غزل

صبا اکبرآبادی

دل اُن تجلیوں کے اُجالے میں رہ گیا
اک چاند تھا سمٹ کے جو ہالے میں رہ گیا
شاید وہی تھا حاصلِ صحرائے زندگی
کانٹا جو میرے پاؤں کے چھالے میں رہ گیا
اس کی دعا پہ ناز کرے ذوقِ بندگی
وہ برہمن جو مر کے شوالے میں رہ گیا
دیکھا ہے ہم نے حادثۂ برقِ و آشیاں
جل کھا کے اک دھواں سا اُجالے میں رہ گیا
عالم دلِ صبا کا ابھی خشک ہو چکا
وہ خون اب نچوڑ جو لالے میں رہ گیا

غزل

انور صدیقی

دامانِ دل فراق کے کانٹوں سے بھر نہ جائے
عیشِ وصالِ یار کا موسم گزر نہ جائے
سب کچھ تو جائے وہ رہے اے شورشِ حیات
لیکن لطافتِ نگہہ مختصر نہ جائے
نے کو روسلئے تو بھری بزم میں مگر
اب فکر ہے کہ آبروئے چشمِ تر نہ جائے
اس سمت آرمیدہ ہے روحِ شبِ بہار
اس سمت موجِ نکہتِ گلہائے تر نہ جائے
ممکن ہے حلقہ ہائے قفس خود ہی ٹوٹ جائیں
اے ہم صفیر دل سے غمِ بال و پر نہ جائے
انور بتانِ دیر سے عرضِ ہنر کرو
بے فائدہ جسارتِ عرضِ ہنر نہ جائے

غزل

ماہر انصاری

تاروں سے چھلکی صہبا اور پھول گنگنائے
ہم دل پہ چوٹ کھا کے اس طرح مسکرائے
دل خوب جانتا تھا جو یہ کرم نما کو
دانستہ اس نگہ کے ہم نے فریب کھائے
شرمندۂ سحر ہو ظلمت شبِ الم کی
پلکوں پہ کوئی آنسو یوں بھی تو جگمگائے
ہے کتنی جان لیوا احساس کی یہ شدت
ہنسنا جو ہم نے چاہا اشک آنکھ میں بھر آئے
دعائے آرزو کی یہ کون سی ادا ہے
ہم خود سے دور ہو کر تیرے قریب آئے
اے ذوقِ پردہ داری یہ کیا ستم ہے آخر
رسوا ہوں اس طرح ہم دنیا خبر نہ پائے
غربت میں آ رہا ہے اب یوں خیال تیرا
جس طرح دور افق پر تارا سا جھلملائے
سب سے الگ ہے ماہر وضعِ حیات اپنی
ہم بھری سبھا میں تنہا بارِ الم اٹھائے

ساگر منتھن

عادل منصوری

میں نے اس جیون ساگر میں
پریم کے امرت رس کے کارن
کیا تھا اک دن ساگر منتھن
لیکن اس جیون ساگر سے
پریم کے امرت رس کے بدلے
دکھ کے وِش کا دھارا نکلا
آج تلک اس دکھ کے وِش کو
میں ہنستے ہنستے پیتا ہوں
کبھی تو اس جیون ساگر سے
پریم کا امرت رس نکلے گا
میں اس آشا میں جیتا ہوں

امید

ایک سوکھے پیڑ کی
ایک ویران شاخ پر
سبز پتہ
مسکراتا ہے خزاں کو دیکھ کر

زندگی

جیسے ننھے بچے کے
نازک نازک ہونٹوں پر
ایک تبسم رقصاں ہو

شاعر

کالی کالی راتوں میں
زندگی کی راہوں پر
جیسے دیپ جلتا ہو

نذرِ امجد

وقار خلیل

تا بہ نفسِ مردِ قلندر ٹوٹا
گلزارِ تصوف ہوا ویران وقار
امجد سا جگر گوشۂ عرفاں رو ٹھا
ماتم ہے گلستاں کا ہے بوٹا بوٹا

اقلیمِ رباعی کے سکندر امجد
دنیا میں سکے جہاں تجھ کو ہم اہلِ اردو
اے مردِ حق آگاہ قلندر امجد
گمراہ تجھے ڈھونڈیں گے رہبر امجد

قطعات

نہال محبوب

عہد و پیماں کو تولنا ہو گا
دل کے پردوں کو کھولنا ہو گا
ہم خطاوار ہیں کہ تم ملزم
وقت کو خود ہی بولنا ہو گا

عہدِ رفتہ کو بھول کر اے دوست
اک نیا باب کھولنا ہو گا
اپنے ہی گلستاں کے پھولوں کو
اب تو کانٹے پہ تولنا ہو گا

ڈاکٹر عندلیب شادانی

سبع سیارہ ـــــــ ایک جائزہ

مولانا ناطق گلاؤٹھوی کی کتاب "سبع سیارہ" کے متعلق میری رائے ہے کہ جو لوگ اس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ مولانا نے بہت سے لطیف نکتے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔

پہلے مضمون "آتش پرست" میں مولانا نے آتش کے کلام پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ لائق تحسین، فکر انگیز اور ادب آموز ہے۔ آتش کے یہاں ایسے غلط اتقاد اور گندے اشعار کافی تعداد میں موجود ہیں جنہیں پڑھ کر ذوق سلیم کو گھن آنے لگتی ہے۔ عریانی ملاحظہ ہو۔

صبح تک وصل کی شب شام سے عریاں رکھا
نہ رہا پیرہن یار کا پردہ باقی

وصل کی شب عیش و عشرت کا یہ ساماں کیجئے
خود بھی عریاں ہو جئے اس کو بھی عریاں کیجئے

تا سحر میں نے شب وصل اسے عریاں رکھا
آسماں کو بھی ذجس مہ نے بدن دکھلایا

وصل کی شب رنگ گردوں نوع دیگر ہو گیا
شام سے یار اُدھ میں جامے سے باہر ہو گیا

کریں گے یار کو عریاں شب وصل ● عیاں ہو جائے گا راز نہانی

لغو اشعار کا نمونہ دیکھئے۔

حسن سے قدرت خدا کی رو نظر آیا مجھے
ریش پیغمبر ترا گیسو نظر آیا مجھے

یہی رہا ذقن یار دیکھ کر افسوس
اچک کے گرتے ہم اس میں اگر کنواں ہوتا

یاد ابرو و ذقن میں اڑ گئی آنکھوں سے نیند
گھر کنواں جھانکا کبھی تلوار کو عریاں کیا

شراب کہنہ سے آلودہ یوں ہوتے ہیں ہم میکش
عروس نو سے قربت جس طرح داماد کرتے ہیں

دشمن ہے جو ایسے کا کچھ رکھتا ہے آتش
شیطان کے نطفے سے ہے وہ ناخلف اے دل

ہم پایہ ہے دو نالی بندوق سے وہ بینی
چھچھوندروں کا کام رو ئے قاتل کے خال کرتے

خواجہ سگ پرست کا قصہ آپ نے ضرور ملاحظہ فرمایا ہوگا اس منصب کے لئے خواجہ حیدر علی آتش کا استحقاق بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

صفا ہوا نہ ریاضت سے نفس امارہ ● کوئی نجاست سگ کا ازالہ کیا کرتا

ارادہ میرے کھانے کا نہ اے زاغ و زغن کیجو
وہ کشتہ ہوں جسے سونگھے سے کتوں کا بدن بگڑا

روز و شب ہنگامہ برپا ہے میان کوئے دوست
ہڈیوں پر میری لڑتے ہیں سگان کوئے دوست

اس ترک سے جو کی ہیں صحرا میں چار آنکھیں
جھنجلا کے کیا ہی کتے چھوڑ دئے ہیں ہرن پر

بوسہ عزیز ہم سے کرے تو ہزار حیف
کم تجھ سے تیرے ہم کو عزیز استخواں نہیں

کوئے جاناں چمن سے بہتر ہے ● اس کا کتا ہرن سے بہتر ہے

چاہے سگ کو دے اسے چاہے ہما کو دے لے
آسماں لے لے جو مشت استخواں درکار ہے

اے ہما سنہ نہ لگانا تو مری ہڈی کو
سگ دیوانہ مجھے کاٹ کے مر جاتا ہے

مستحق اس کا ہما بھی ہے سگ یار بھی ہے
استخوانوں کے مرے دو ہوں برابر ٹکڑے

کسی حالت میں نہ ظاہر ہو جو ہو اصل نجس
سرخ ہو یا کہ ہو رنگ سگ ناپاک سیاہ

گلے ہاتھوں چند مکروہ اشعار اور بھی سن لیجئے۔

ہوا جو گوش زد افسانہ حسن یار کا آتش
ہماری رال ٹپکی شربت دیدار پر کیا کیا

شیریں لبوں کے اوپر رال اپنی ہے ٹپکتی
بوسے کا نام سن کر ہم منہ پسارتے ہیں

تعریف تیرے حسن جوانی کی کیا کروں
طفلی میں تجھ پہ رال ٹپکتی تھی پیر کی

وہ حسن جوانی ہے ترا پیر کے مانند
دیکھے سے جسے رال لب پیر سے ٹپکے

نہا کر سر کرہیں آتش آب تیغ قاتل سے
خدا چاہے تو پاک اس زندگی کا گند کرتے ہیں

دیکھے نگہ بد سے جو عیسیٰ نفسوں کو
کوڑھی کی طرح شومی تقدیر سے ٹپکے

سونگھ کر منہ کو ترے سونگھا تو بدتر نکلی
دہن غنچہ کی بو گند بغل کی بو سے

ان اشعار کو مشتے نمونہ از خروارے سمجھئے ورنہ خواجہ صاحب کا دیوان ماشاء اللہ ان جواہر پاروں سے مالا مال ہے۔ مگر اس مضمون میں ایک بات قابل غور ہے صفحہ ۱۳ پر مولانا کا ارشاد ہے "غالب جیسے علامہ اور قادر الکلام کے اس شعر کو ـــــ یہ مسائل تصوف الخ ـــــ صرف دعویٰ ہی دعویٰ بتانا کس قدر منصفی کا فعل ہو سکتا ہے" تا خاتمہ عبارت ـــــ

اس بیان سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ مولانا، غالب کو صوفی شاعر مانتے ہیں۔ لیکن صفحہ ۱۲۲ کے مطالعہ سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مولانا نے لفظ علامہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے بعد خود مولانا کا غالب کے لئے لفظ علامہ لکھنا تعجب انگیز ہے۔

خواجہ صاحب کی علمی لیاقت کا حال سب کو معلوم ہے۔

چند شعر میں بھی نقل کرتا ہوں۔

میکشی سے یار کی کیوں کر نہ ہو دل کو سرور
نشے میں اس کے ہمارا مدعا ہو جائے گا

شمائل عطر ہے فی الواقعی عنبر ہونا۔
عقل سے ہوتا ہے فی الواقعی جاہل خالی۔
فی الواقعی مقام مسیحا بلند ہے۔

کچھ کچھ اثر تو ہونے لگا جذب عشق کا
غش غش کے ہم کو یار نے بھیجا گلاب کو

اس "کو" کی تعریف نہیں ہو سکتی معلوم ہوتا ہے کہ غالباً محبوبہ کی خادمہ کا نام گلاب تھا۔

اس شعر کی ترکیب کا جواب اردو شاعری میں مشکل سے ملے گا۔

ہوا جو دسترس اس کا بھی پائے قاتل تک
حنا بھلائیگا — شوخی مرا — لہو تیری

غرض کہاں تک لکھوں۔ اس طومار خرافات کے لئے تو ایک دفتر چاہیئے۔

دوسرا مضمون "کلیل میں غلیل"

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں' کے متعلق ہے۔ میں بھی اس پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور میری رائے بھی وہی ہے جو مولانا کی ہے۔

تیسرا مضمون "جگر پارے" بہت خوب ہے۔ انتقاد نہایت صحیح اور نقاد کے تبحر علمی کا آئینہ دار ہے۔ میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور جگر دوستوں میں جگر دشمنی کے لئے خاصا مشہور بلکہ بدنام ہوں۔

چوتھا مضمون "ماہر القادری کا تعارف" مجھے پسند آیا۔ اس قسم کے مدعیان علم و فضل کی قلعی کھولنا اور ناواقفوں کو گمراہی سے بچانا اہل علم کا فرض ہے۔

پانچواں مضمون "میں نے داغ کا تلمذ کیوں اختیار کیا" دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔ مگر ایک امر میں مولانا کو اشتباہ ہوا ہے انھوں نے مکاتیب امیر مینائی کا مرتب ثاقب کانپوری کو ٹھہرایا ہے حالانکہ ثاقب کانپوری کو اس سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ثاقب کان پوری جن کا اسم گرامی مولانا ابو محمد (ثاقب کان پوری) ہے ہنوز بقید حیات ہیں۔ مکاتیب امیر مینائی کے مرتب مولانا احسن اللہ خاں ثاقب (مدیر رسالۂ قند پارسی' پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار) ہیں۔ موصوف کا وطن غالباً آگرہ تھا وفات کو ایک زمانہ گزرا۔ شاید اشتراک اسم کی بنا پر یہ التباس ہوا۔

چھٹا مضمون لفظ علامہ کی تشریح ہے اور بہت خوب ہے۔ اس میں صرف ایک بات محل نظر ہے۔ مولانا کا خیال ہے لفظ علامہ ہندوستان میں اہل علم و فضل کے لئے ہمارے زمانے سے پہلے کبھی استعمال نہیں ہوا۔ کم سے کم ایک مثال تو اس وقت میرے ذہن میں موجود ہے اور وہ بھی تین سو سال پرانی۔ انشائے ابوالفضل کے مرتب عبدالصمد نے جو ابوالفضل کا بھانجا بھی تھا اور داماد بھی' انشائے ابوالفضل کے دیباچہ میں یہ قطعہ نقل کیا ہے :-

عالم عامل و علامۂ عصر ● عارف کامل و خاص زمان
آصف عہد فلاطون زمن ● شیخ ابوالفضل وزیر خاقان

آخری اور ساتواں مضمون "بے رحم نقاد" ہے۔ میں مولانا کو بے رحم ہرگز نہیں کہوں گا۔ فصاد تو نشتر زنی کرتا ہے مگر اسے بے رحم کوئی نہیں کہتا کیونکہ اس کا مقصد فاسد مادہ کو خارج کرکے مریض کے مزاج کو اعتدال پر لانا ہوتا ہے اور یہی مقصد مولانا کا ہے۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ کہیں کہیں مولانا کے لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی ہے' اور یہ تلخی صرف اسی مضمون میں نہیں بلکہ دوسرے مضامین میں بھی ہے۔ اگر اس تلخی کے اسباب کو پیش نظر رکھا جائے تو مولانا کو حق بجانب ماننا پڑے گا۔ لیکن یہ تلخی اگر نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ کیونکہ مولانا کی شان علم اس کی متقاضی ہے ایک زمانہ تھا کہ خود میری تحریروں میں بھی اس قسم کی تلخی بلکہ زہرناکی ہوتی تھی۔ مگر اب غالباً بتقاضائے سن اور شاید اس لئے بھی کہ جوں جوں آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ کوئی دل آزار کلمہ میرے قلم سے نہ نکلنے پائے۔

کتاب میں کتابت کی غلطیاں جا بجا ہیں۔ مگر اسکے ذمہ دار آپ ہیں یا آپ کا کاتب۔ ایک غلطی بار بار ہوتی ہے اور وہ سخت ناقابل گرفت ہے۔ آپ کے کاتب نے "پروا" کو بالالتزام "پرواہ" لکھا ہے۔ مولانا سے اس قسم کے سہو القلم کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ نامراد کاتب کی کارستانی ہے۔

(یہ تحریر محمد عبدالحلیم نے بغرض اشاعت بھجوائی تھی۔ ادارہ)

مراسلات

مولانا روم کا قدیم نسخہ

ہماری زبان میں ڈاکٹر نذیر احمد کے مراسلے "مولانا روم کا قدیم نسخہ" میں ترکی کتب خانوں کے چند نسخوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔

میں آج سے تقریباً تین سال پہلے ترکی گیا تھا اس وقت قونیہ میں "موزہ آثار قدیمہ" نامی کوئی میوزیم نہیں تھا لیکن جس نسخے کا ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا ہے وہ میں نے اس "مولانا موزہ سی" میں دیکھا ہے جو ۳ر مارچ ۱۹۲۷ء کو قائم کیا گیا ہے۔ یہ نسخہ حضرت مولانا کی وفات کے ۵ سال بعد ماہ رجب ۶۷۷ھ میں لکھا گیا تھا اس کی کتابت قونیہ کے مشہور خطاط عبداللہ المولوی کے لڑکے محمد نے کی ہے اور مخلص نامی شخص نے اپنے آرٹ سے اس کو مزین کیا ہے۔ یہ نسخہ جیسا کہ محمد اونڈر نے اپنی کتاب "قونیہ" میں لکھا ہے، حضرت مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد اور ان کے خلیفہ حسام الدین چلپی دونوں کے مطالعے میں رہ چکا ہے اور اس کا متن جو حضرت مولانا اور ان کے خلیفہ (حسام الدین چلپی) کے مطالعہ سے گزر چکا تھا۔ اسی "مولانا موزہ سی" میں ایک اور نسخہ ۷۶۸ھ (۱۳۶۶ء) کا تحریر کردہ اور دو نسخے ۱۳۲۲ء اور ۱۳۷۰ء کے تحریر کردہ بھی موجود ہیں۔

قسطنطنیہ یعنی استانبول میں بھی "کتابخانہ ظہیر آفندی" نام کا کوئی کتبخانہ موجود نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اس کتب خانے کا وجود رہا ہو لیکن اب اس کا قطعی علم نہیں ہے کہ اس کی کتابیں کہاں ہیں۔ اسی طرح اب نافذ پاشا کتب خانہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس کی کتابیں البتہ اور دوسرے ۹۶ کتب خانوں کے ذخیروں کے ساتھ استانبول کے "سلیمانیہ عمومی کتب خانہ سی" میں محفوظ کر دی گئی ہیں جہاں ۱۹۵۵ء میں فارسی مخطوطات کی تعداد ۲۲۲۱ اور عربی مخطوطات کی تعداد ۳۰۳۹۰ تھی۔ ممکن ہے کہ اس کتب خانے میں نافذ پاشا کا وہ نسخہ موجود ہو جس کی تاریخ کتابت ۵ ربیع الاول ۶۸۰ھ اور کاتب اسمٰعیل بن سلیمان بن محمد الحافظ ہیں لیکن اس کتبخانہ میں "کتابخانہ ظہیر آفندی" کا غالباً کوئی بھی نسخہ موجود نہیں ہے کیونکہ جن کتب خانوں کی کتابیں اس کتب خانے میں ۱۹۵۵ء تک شامل کی گئی ہیں ان کی فہرست راقم کے پاس موجود ہے اور اس میں اس کتبخانہ کا نام نہیں ہے۔ اس "سلیمانیہ عمومی کتبخانہ سی" میں میں نے حضرت مولانا روم کی مثنوی کا ایک سرا نسخہ البتہ دیکھا تھا جس کی تاریخ کتابت ۱۱۰۰ھ درج ہے۔

ان نسخوں کے علاوہ اس وقت ترکی میں منیسہ کے "عمومی کتب خانہ سی" میں ۷۴۰ھ کا تحریر کردہ ایک نسخہ، برصہ کے "اورخان غازی کتب خانہ سی" میں ۷۳۲ھ کا ایک نسخہ، نوشہر کے "داماد ابراہیم پاشا کتب خانہ سی" میں ۸۱۴ھ کا ایک نسخہ، برصہ کے "برہان الدین بے کتب خانہ سی" میں ۸۳۳ھ اور ۸۳۴ھ کے دو نسخے، قیصری کے "عمومی کتبخانہ سی" میں ۹۷۷ھ کا ایک نسخہ اور منیسہ کے "عمومی کتبخانہ سی" میں ۸۸۲ھ اور ۸۹۶ھ کے تحریر کردہ دو نسخے اور بھی موجود ہیں۔

(اکمل ایوبی۔ علی گڑھ)

اُردو کی باتیں

(متعلق "ہماری زبان" مورخہ ۲۲ر مارچ ۱۹۶۱ء)

(۱) اُردو کی غیر مطبوعہ نثری داستانیں ضرور شائع کی جائیں۔ یہ کام انجمن کے کرنے کا ہے۔ طباعت کے لئے سرمایہ قارئین سے وصول کیا جائے، پیشگی قیمت کی صورت میں۔ داستانیں مختلف جلدوں میں شائع ہوں تاکہ پیاس بجھنے کے بجائے بڑھتی جائے اور نتیجتاً لوگ بقیہ جلدوں کے لئے دوبارہ پیشگی قیمت بخوشی ادا کریں۔ اس طرح یک مشت کوئی بڑی رقم کا سوال نہیں پیدا ہوگا۔

(۲) گیان چند صاحب، مولوی عبدالحق صاحب کی بات پر خواہ مخواہ بگڑ بیٹھے۔ ان لوگوں نے تو پاکستان بنایا ہی تھا اردو کے نام پر (گو اُردو کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا) اور پاکستان میں اُردو کی جو حالت ہے اور مولوی صاحب کی امیدوں پر جس طرح پانی پھرا ہے اس حساب سے مولوی صاحب کی "خوشامد مصلحت" کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ اس جھگڑے سے دونوں انجمنوں کو شدید نقصان پہنچے گا جو اُردو کے لئے کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوؤں کی اکثریت کی مادری زبان اُردو نہیں ہے! ورنہ اکثریت کے دورِ حکومت میں اُردو کے تنِ نازک پر یہ متعصبانہ کوڑے کیوں؟

(۳) سہیل مالیگانوی صاحب کا یہ خیال درست ہے کہ اُردو کے لئے ہندی رسم خط غیر موزوں ہے۔ ذرا ہندی رسم خط میں "اِک" (ایک) تو لکھیئے!

(۴) مادری بھاشا ہمارے وزیر اعظم نے موجودہ مردم شماری میں اپنی "مادری بھاشا" "Urdu-Hindi" لکھائی ہے۔ افسوس ہے کہ "ہماری زبان" میں اس پر کسی قسم کی گرفت نہیں کی گئی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ پنڈت جی کی مادری زبان اُردو ہے۔ پھر پنڈت جی نے یہ غلط اندراج کیوں کرایا؟ اگر وہ اپنی مادری زبان اُردو لکھانے میں کسی قسم کی جھجک محسوس کر رہے تھے تو ہندی لکھا دیتے! کیا اس طرح انھوں نے ہندی اور اُردو دونوں کو نقصان نہیں پہنچایا ہے؟

دستورِ ہند میں URDU-HINDI کے نام سے کون سی زبان تسلیم کی گئی ہے؟

اگر پنڈت جی اپنی مادری زبان ہندی لکھاتے اور اُردو ثانوی زبان، تو اس سے واقعی اردو کو فائدہ پہنچتا۔

(اقبال کرشن)

انجمن کا خبر نامہ

یو.پی اسمبلی میں اُردو کا ذکر

وزیر اعلیٰ مسٹر سی.بی گپتا نے ایوان میں اُردو کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "سرکار اُردو کی ترقی میں کسی طرح کی رکاوٹ ڈالنا نہیں چاہتی نہ موجودہ دستورِ ہند کے مطابق اُردو زبان کے استعمال میں رکاوٹ ڈالنا ممکن ہے۔ انھوں نے مزید یہ فرمایا کہ عنقریب اُردو کمیٹی بن جائے گی، اس کی رکنیت کی منظوری کے لئے بارہ چودہ حضرات سے خط کتابت ہو رہی ہے۔"

حیات اللہ انصاری صاحب نے محکمۂ اطلاعات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ محکمہ بہت مفید خدمت انجام دے سکتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس محکمہ کو اردو سے نفرت ہے۔ کو اپریٹو اور صنعتوں کا وہ لٹریچر جس سے صرف اُردو داں طبقے کو کام پڑتا ہے وہ بھی اردو میں نہیں چھاپا۔ (قومی آواز)

اُردو لائبریری ساگر

حالیہ فسادات میں اُردو لائبریری ساگر بھی نذرِ آتش کر دی گئی۔ لائبریری کی مجلسِ عاملہ نے اپنے جلسے میں ایک قرارداد منظور کی اور اس کی نقلیں متعلقہ افسران و اعلیٰ حکام کی خدمت میں بھیجی گئیں۔ قرارداد میں کہا گیا کہ یہ لائبریری تیس سال سے قائم تھی اور اسے ۹ر فروری کے ہنگامے میں تباہ کر دیا گیا۔ اُردو لائبریری ساگر کی مجلسِ عاملہ حکومتِ مدھیہ پردیش سے اُردو لائبریری کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے مالی امداد اور ذخیرۂ کتب کی فراہمی کا مطالبہ کرتی ہے۔ لائبریری کو فی الحال فوری طور پر جاری کر دینے کے لئے مقامی میونسپل ہائی اسکول اور مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول کا وہ تمام اُردو کتب کا ذخیرہ مرحمت کرنے کی اپیل کرتی ہے جو وہاں اب اُردو ذریعۂ تعلیم نہ ہونے سے بیکار پڑا ہوا ہے۔ (صدیق رضا سکریٹری)

نوساری (ضلع سورت) میں شاخ کا قیام

انجمن ترقی اُردو شاخ احمد آباد گجرات کی جانب سے مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی، جمال الدین قادری اور پروفیسر سید وارث حسین علوی یہاں آئے تھے۔ انکی کوششوں سے یہاں انجمن کی شاخ کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ عہدیداران حسبِ ذیل ہیں:

صدر: عبدالقادر عثمانی ایڈووکیٹ۔ نائب صدر: غلام محمد گاندے۔

اعزازی جنرل سکریٹری: پروفیسر مرتاض حسین قریشی۔

اعزازی نائب سکریٹری: امام الدین درگاہ والا جرنلسٹ۔

اعزازی نائب سکریٹری: ماسٹر شیخ حسین۔ نائب سکریٹری: غلام نبی کامل انصاری۔

فی الحال ایک سو نو ممبر ہیں۔ لیکن امید ہے کہ ممبروں کی تعداد تین چار سو تک پہنچ جائے گی۔ (جنرل سکریٹری)

بزمِ احباب (بریلی)

"بزمِ احباب" بریلی کا سہ ماہی طرحی مشاعرہ ۳ر اپریل شام کے نو بجے حکیم رشید احمد معتصم کے مکان پر منعقد ہوا۔ پروفیسر عبدالشکور نے مشاعرہ کی صدارت فرمائی اور اس صحبت میں مندرجۂ ذیل شعراء نے شرکت فرمائی:-

سُہا صاحب ڈائرکٹر دفتر روزگار بریلی، ماتا پرشاد زیبؔ، جرأتؔ، انورؔ صدیقی، مہیش پرشاد فرارؔ، کشن لال ثاقبؔ، رازیؔ، کیفیؔ، فیاضؔ، دیاؔ۔

طرحِ اوّل: دل پہ ہجومِ غم ہو، جبیں پر شکن نہ ہو۔

طرحِ دوم: پائے ساقی پہ بھی اک لغزشِ مستانہ سہی۔

فارسی طرح: وابستہ سوئے محشر رسیدن گناہ کیست۔

تقریباً ڈیڑھ بجے شب مشاعرہ بڑی کامیابی اور خیر و خوبی سے ختم ہوا۔ شہر کے ممتاز اہلِ ادب نے مشاعرے میں شرکت کی۔

(اختر نظامی، جنرل سکریٹری)

بزمِ ادب پنجاب (جالندھر)

۲ر اپریل کو ٹاؤن ہال جالندھر میں بزمِ ادب پنجاب (جالندھر) کا سالانہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ پنجاب کانگریس کمیٹی کے صدر و آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر سردار دربارا سنگھ نے اس ادبی تقریب کی صدارت کی۔ یہ جلسہ حضرت جوشؔ ملسیانی کی سالگرہ کی تقریب میں منعقد ہوا تھا۔ جناب جوشؔ اور ابر احسن گنوری کے علاوہ بہار نگوی، گمبھیر داس ساحرؔ سیالکوٹی، سادھو سنگھ ہمدرد، نانک چند نازؔ، کرشن گوپال مخمورؔ، رشی پٹیالوی، عارج روپڑی، کمار کرتارپوری، زار کپور تھلوی، امر چند قیسؔ، اخترؔ رضوانی، پورن سنگھ ہنرؔ، دردؔ نکودری، سوہن لال ساحرؔ، جناب آنند ڈی سیال مجسٹریٹ، ساگرؔ نکودری، بھگت رام عیشؔ، کوثرؔ لدھیانوی، جگرؔ جالندھری، افسرؔ بیلوی، جوہرؔ جالندھری، پربھ دیال لعل، نند لال شوقؔ، ستیہ نند شاکرؔ، ہزارا سنگھ مشتاقؔ، صنعتی سیالکوٹی، اجیت کمار دولؔ، ن۔ن نجمی، اور سورج کنول سرورؔ (جنرل سکریٹری بزمِ ادب) نے مشاعرے میں اپنا کلام سُنایا۔

نائب وزیرِ تعلیم پنجاب جناب لیش پال، اور ضلع کے اعلیٰ حکام بھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔ (سکریٹری)

امجدؔ مرحوم

انجمن ترقی اُردو (بنگلور) کا ایک جلسہ زیرِ صدارت سید باقر رضا واسطی بتاریخ ۷ر اپریل ۱۹۷۱ء عیسوی منعقد ہوا۔ حضرت امجدؔ حیدرآبادی کے انتقال پر حامد خاں معتمد انجمن کی پیش کی ہوئی قراردادِ تعزیت منظور کی گئی۔

قرارداد میں گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا گیا کہ حضرت امجدؔ کے انتقال سے اُردو شاعری میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کو آسانی کے ساتھ پُر نہیں کیا جا سکتا۔

(حامد خاں، معتمد انجمن)

رسالہ "مجلس" (سہ ماہی) کا "مولوی عبدالحق نمبر"

اُردو مجلس، حیدرآباد (آندھرا پردیش) کے سہ ماہی ترجمان "مجلس" کا "مولوی عبدالحق نمبر" محمد منظور احمد کے زیر ادارت شائع ہوگیا ہے، جس میں (۱۱) پیامات و تاثرات، (۱۲) نظمیں اور ہندستان و پاکستان کے (۲۸) ادیبوں کے گراں قدر مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے چند اہم خطوط بھی شریکِ اشاعت ہیں۔ خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائپ میں شائع شدہ یہ شمارہ (۲۴۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس خصوصی شمارے کی قیمت تین روپے رکھی گئی ہے اور یہ محمد منظور احمد ایڈیٹر "مجلس" (سہ ماہی) اُردو مجلس، اُردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد (آندھرا پردیش) کے پتے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

"سب رس" کا امجد نمبر

ادارۂ ادبیات اُردو (حیدرآباد) کی جانب سے سرمد دکن حضرت امجد حیدرآبادی کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ماہنامہ "سب رس" کا "امجد نمبر" ماہ اگست ۱۹۷۱ء عیسوی میں شائع کیا جائے گا۔

جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معتمد عمومی ادارہ ہٰو جناب وقار خلیل ایڈیٹر سب رس نے ہند و پاکستان کے ادیبوں شاعروں اور نقادوں سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنی نگارشات جلد از جلد دفتر سب رس "ایوان اُردو" خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن ۴ کے پتے پر روانہ فرمائیں۔ (وقار خلیل)

ایک ادبی نشست

مدراس۔ جناب عبداللطیف فاروقی مدیر روزنامہ "مسلمان" کی زیر صدارت ایک مخصوص ادبی نشست بتاریخ ۱۳ر اپریل ۱۹۷۱ء منعقد ہوئی جس میں شہر مدراس کے سربرآوردہ شعراء نے شرکت فرمائی۔ اس مخصوص ادبی نشست کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اردو شعر و ادب کا حلقہ وسیع سے وسیع تر کیا جائے۔ مسرت کا مقام ہے کہ یہ نشست توقع سے بڑھ کر کامیاب رہی۔ حبیب خاں سروش نے جناب صدر، شعرائے کرام اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔ صدر کی تقریر کے بعد شعراء کی تقدیم و تاخیر کی مروجہ روایت کو نظر انداز کرتے ہوئے مشاعرے کا آغاز ہوا جس میں تحمل، حیات، فوقی، دل، بدر جمالی، کاوش، آثم، کمال، سرمدی اور سروش نے کلام سُنایا۔ مشاعرے کے اختتام پر کاوش بدری کی تحریک پر ایک تعزیتی قرار داد منظور ہوئی جس میں حضرت امجد حیدرآبادی کے انتقال پر ملال پر رنج و الم کا اظہار کیا گیا۔ اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ اس کے بعد جناب دل تاج محلی نے جناب صدر، شعرائے کرام، حاضرین اور معزز میزبان کا موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

(کمال مدراسی)

انجمن تعمیر اُردو دلّی

انجمن تعمیر اُردو دلّی کی دو نشستیں ۲ر اپریل و ۹ر اپریل ۱۹۷۱ء کو منعقد ہوئیں جس میں عالمی امن کانفرنس کے اجلاس و ہند و پاک کلچرل کانفرنس میں شرکت کرنے والے اُردو شعراء و ادباء اور دیگر بیرونی مہمانوں نے شرکت کی۔

۲ر اپریل کی نشست کی صدارت خواجہ محمد شفیع دہلوی نے کی۔ شرکاء میں سید سجاد ظہیر، شاہد احمد دہلوی، جاں نثار اختر، عادل رشید، حسن شہیر، مسعود سلطانہ، انجم گنوری، خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی، چودھری منظور الحق ایم ایل اے، سمیع اللہ قاسمی، سید عبدالخالق نقوی، گلزار دہلوی، غلام احمد فرقت، عزیز وارثی، افگن نجیب آبادی نے جلسے کو خطاب کیا اور کلام سُنایا۔

۹ر اپریل کی نشست کی صدارت جناب صولت ٹونکی نے فرمائی۔ گلزار دہلوی کی نظم، انور کمال حسینی کا مضمون "اُردو ناول نگاری و ناول نگار" تبادلۂ خیالات کے لئے پیش کیا گیا۔ محمد عرفان، رضا ٹونکی، سلام مچھلی شہری، مولانا حیرت بدایونی، ڈاکٹر منوہر سہائے انور، اور صدر جلسہ نے اپنا کلام سنایا۔ (جنرل سکریٹری)

یوم حسرت

۱۳-۱۴ مئی ۱۹۷۰ء کو فیروز آباد میں یوم حسرت منایا گیا۔ جس میں حسرت کی حیات اور شاعری پر مبسوط مقالے پڑھے گئے۔ شام حسرت منائی گئی جس میں حسرت کی منتخب غزلیں ساز و آہنگ کے ساتھ پیش کی گئیں اور ایک مخصوص بزم سخن منعقد ہوئی جس میں مندرجہ ذیل ادیبوں نے شرکت کی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، عابد رضا بیدار، عالم فتحپوری، رفیع اللہ عنایتی، ایم حبیب خاں، شاعر ندیم، سید امین اشرف، انور صدیقی، شہریار، امیر عارفی اور اعجاز عسکری۔

مقالات کی تفصیل یہ ہے:- اُردو شاعری میں حسرت کا مرتبہ۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، مشاہدات زنداں۔ رفیع الدین احمد، حسرت کا مزاج۔ محمد عظیم، اُردوئے معلّیٰ عابد رضا بیدار، حسرت کی سیاسی زندگی۔ رفیع اللہ عنایتی، حسرت بحیثیت محقق۔ ایم حبیب خاں، حسرت اور انکے نکتہ چیں۔ اعجاز عسکری۔ (نامہ نگار)

اُردو شعبہ بحال کردیا گیا

کینندوا ہائی اسکول بردوان جہاں جنوری ۱۹۵۷ء سے اُردو شعبہ اور اُردو ذریعہ تعلیم کو یکسر ختم کر دیا گیا تھا، وہ جمعیتہ علماء کلٹی اور سکریٹری جمعیتہ علماء مغربی بنگال کی چار سالہ مستقل جد و جہد کے نتیجہ میں بحال کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اُردو طلبہ کی وہ دقتیں جو تعلیم کے لئے سنگ راہ بنی ہوئی تھیں ختم ہو گئیں اور اب ۱۵ر فروری ۱۹۷۱ء سے کینندوا ہائی اسکول (بردوان) میں اُردو کا شعبہ پوری تندہی سے اپنے تعلیمی فرائض انجام دے رہا ہے۔

(سید احمد ہاشمی۔ کنوینر مجلس تعلیم و اشاعت جمعیتہ علماء مغربی بنگال)

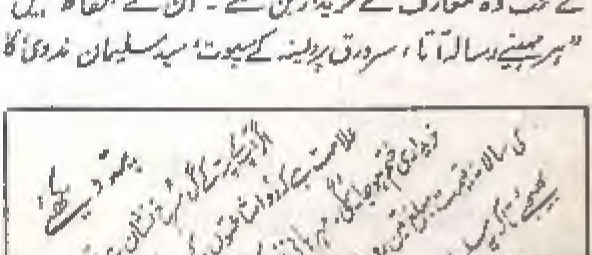
بقیہ

دیسنہ لائبریری مرحوم

لائبریری کو وہ کتاب کبھی ایک آنہ سے زیادہ میں نہ پڑتی! اس کا راز کیا تھا؟ وہ سُن لیجیے۔ لائبریری کے ناظم سید عبدالحکیم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ تاریخ و سیر، مذہب و فلسفہ، شعر و ادب، غرض ہر عنوان پر ان کی نگاہ گہری ہوتی تھی۔ رسالوں اور اخباروں میں وہ نئی کتابوں کے ریویو پڑھتے، ناشرین کی فہرستوں کا مطالعہ کرتے پھر جب کوئی نئی کتاب لائبریری کے منگوانی ہوتی تو وہ پیسے کا کارڈ ناشر کو لکھ دیتے کہ اس کتاب کی ایک جلد فلاں صاحب کے پتہ پر وی پی کر دی جائے، اور دوسرے کارڈ کے ذریعے اس کارروائی کی اطلاع ان صاحب کو بھیج دی جاتی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جن لوگوں کے نام یہ حکمنامہ جاری ہوتا وہ صرف اہل دیسنہ ہوا کرتے جو سلسلۂ روزگار مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے تھے۔ پھر ان کو یہ حکم ملتا کہ اگلی تعطیل میں وطن آؤ تو کتاب ساتھ لیتے آنا۔

اس طریقۂ کار کا دلچسپ نتیجہ کبھی اس طرح ظہور میں آتا کہ چھٹیوں میں کوئی پیشکار صاحب بغل میں فلسفہ کی کتاب دبائے ہوئے یا پولیس کے حوالدار صاحب تاریخ ہسپانیہ لئے ہوئے یا وکیل صاحب تاریخ الاطبا لے کر لائبریری میں داخل ہوتے دکھائی دیتے۔ یہ کتابیں رجسٹر میں درج ہو جاتیں اور "کیفیت" کے کالم میں لکھا جاتا "عطیہ منجانب ـــــــ" بس یہی دو لفظ اس کتاب کی قیمت تھی جو اس کے خریدنے اور لانے والے کو لائبریری کی طرف سے ادا کی جاتی۔ یہ نسخہ ایسا آزمودہ تھا جو کبھی فیل نہیں ہوا۔ کیونکہ "حکیم چچا" یا "حکیم بھائی" کے اس حکم کو ماننے سے انکار کرنا، دیسنہ کو وطن ماننے سے انکار کر دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ جو ترکیب نئی کتابوں کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی وہی رسائل کے لئے بھی کام آتی تھی۔ اس طریقۂ کار نے ایک طرف اہل دیسنہ کو، (چاہے وہ کہیں بھی رہتے ہوں) اردو کی اعلیٰ درجہ کی کتابوں اور معیاری رسالوں سے روشناس کرایا تو دوسری طرف انھیں کتابوں اور رسالوں کو سلیقے سے رکھنا بھی سکھا دیا۔ آبکاری کے ایک داروغہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جب کہ یہ کسی چھوٹے موٹے قصبے میں تعینات تھے۔ انھیں اپنے ہم وطن علامہ سید سلیمان ندوی کی ذات گرامی پر بڑا فخر تھا اور عقیدت بھی، چنانچہ اسی جذبے کے تحت وہ "معارف" کے خریدار بن گئے۔ ان کے الفاظ میں "ہر مہینے رسالہ آتا، سرورق پر لینے کے بعد سید سلیمان ندوی کا نام چھپا ہوا دیکھ کر سر اونچا کر لیا کرتا مگر چونکہ مضامین عالم بالا سے تعلق رکھتے تھے اس لئے پڑھنے کی توفیق کبھی نہ ہوتی۔ ہاں دیسنہ والوں کی عادت کے مطابق بڑے سلیقے سے ان رسالوں کو میز پر جمع کرتا جاتا۔" ایک بار کسی الزام پر ان داروغہ صاحب سے کیفیت طلب ہو گئی۔ ایک افسر (جو اردو داں تھا) تحقیقات کے لئے آیا اور اتفاق سے اپنی رپورٹ اسی میز پر لکھنے بیٹھا۔ یہاں اسکی نظر "معارف" کے شماروں پر پڑی۔ حیرت ہوئی، آبکاری کا داروغہ اور معارف کا مطالعہ؟ جھجکتے ہوئے اس نے پوچھا:- آپ کے یہاں یہ معارف کیسے؟" بلا توقف داروغہ صاحب نے کہا "حضور! میں تو اس کا مستقل خریدار ہوں۔" یہ سُننا تھا کہ وہ رعب طاری ہوا کہ تحقیقات الگ رہی، افسر نے معذرت کرتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لی اور معارف کے "قدرداں" حیران و ششدر ان کا منھ دیکھتے رہ گئے۔

کتابوں اور رسالوں کی فراہمی کے بعد ان کی جلد سازی حفاظت اور صفائی کی ذمہ داری دیسنہ کے نوجوانوں کی تھی۔ یہ کام ان کی جمعیۃ الطلبا انجام دیا کرتی تھی۔ جمعیۃ الطلبا کے ناظم کو دیسنہ لائبریری کا نائب معتمد تو بنا دیا جاتا تھا لیکن بے چارے طالب علموں کے پاس کون سا سرمایہ تھا جس سے وہ اپنی ذمہ داری پوری کر سکتے؟ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؛



والی بات تھی۔ بہت دنوں تک یہ ایک پیچیدہ مسئلہ بنا رہا۔ آخر اجتہاد کی نوبت آئی اور ایک انقلابی قسم کا فتویٰ دیا گیا۔

دیسنہ میں شادی کے موقعوں پر دولہا کے بازو پر امام ضامن باندھے جاتے ہیں۔ خصوصاً رشتے کی عورتیں اس میں پیش پیش ہوتی ہیں۔ اس کے پیچھے عقیدے کے بجائے رسم کو دخل ہوتا تھا کیونکہ شادی زیادہ تر آپس ہی میں ہوا کرتی تھی اس لئے سفر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اور جب سفر در پیش نہ ہو تو پھر امام ضامن کا باندھنا غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کے مدنظر طلبہ نے فتویٰ دیا کہ ایسے تمام امام ضامن کھول کر جمعیۃ الطلبا کے سپرد کر دیے جائیں اور ان کی رقمیں کتب خانے میں جلد سازی کے حساب میں جمع کر دی جائیں۔ جب یہ بات عام طور پر معلوم ہو گئی تو عورتوں نے ہم خرما و ہم ثواب پر عمل کرتے ہوئے، اپنی شفقت کا اظہار کرنے اور کتب خانے کی ضرورت پورا کرنے میں اور زیادہ فیاضی سے کام لینا شروع کیا۔ جمعیۃ الطلبا کے ناظموں میں سید محمد نسیم (مقیم ڈھاکہ) بڑے با اصول تھے، وہ امام ضامن کی رقمیں ہی نہیں، بلکہ کناری اور گوٹ لگے ہوئے کپڑے کو بھی بیچ کر رقم حاصل کر لیا کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی ڈھاکہ کے مشہور معالج ڈاکٹر سید محمد شمیم نے بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں کتب خانے کی مختلف حیثیتوں سے بڑی خدمت انجام دی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ جب کبھی دیسنہ تشریف لاتے اپنے وقت کا فی حصہ اس کتب خانے میں صرف کیا کرتے۔ ان کی بعض تصانیف تو، جیسا ان کے دیباچے میں درج ہے، یہیں بیٹھ کر مکمل ہوئیں۔ سید صاحب کو اپنے وطن کے ذرے ذرے سے کیسی بے پناہ محبت تھی۔ ان کے خطوط (بالخصوص سید عبد الحکیم کے نام) بتائیں گے۔ ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۲۷ عیسوی کو انھوں نے لکھا: "رمضان کے دن گزر رہے ہیں مگر دیسنہ کا لطف میسر نہیں۔ وہاں کا عجیب نظارا ہے۔ فرصت مل سکے تو رمضان کا مہینہ لا زماً دیسنہ میں بسر کر دوں۔" یہ تو نہ ہو سکا لیکن جب تک مولانا ہندوستان میں رہے وہ گرمی کے دنوں میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہر سال اپنے وطن میں ضرور گذارا کرتے تھے۔ یہی حال ان کے بھتیجے مولوی سید ابوظفر ندوی (مصنف تاریخ گجرات وغیرہ) کا تھا جو بالالتزام احمد آباد سے آیا کرتے تھے۔

کتابوں کے علاوہ کتب خانے کی چھوٹی بڑی جیسیوں دوسری ضرورتیں، قلم دوات سے لے کر الماریاں، میز کرسی وغیرہ تک اہالیان دیسنہ انفرادی طور پر پورا کیا کرتے تھے لائبریری کے سالانہ چندہ سے ان ضرورتوں کا پورا ہونا ممکن نہ تھا۔

دیسنہ لائبریری میں مخطوطات، نادر مطبوعہ کتابوں اور رسائل کی جلدوں کی کوئی مطبوعہ فہرست نہیں تھی پھر بھی اس کی معنوی خوبیوں کا تعارف مختلف طریقوں سے کرایا جاتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے رسالہ اُردو میں نجیب اشرف ندوی نے اپنے ایک مضمون میں اس کتب خانے کا اجمالی ذکر کیا۔ پھر راقم الحروف کا ایک مضمون "کتب خانۃ الاصلاح"[1] کے عنوان سے رسالہ "ندیم" گیا میں دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا جس کے ذریعہ یہاں کے قدیم اور نایاب رسائل، بعض مخطوطات اور نادر مطبوعہ کتابوں کا تعارف کرایا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں کتب خانے کی طلائی جوبلی منائی گئی تو اس موقع پر جمعیۃ الطلبا نے اپنے ایک سرگرم کارکن سید عبد القوی کی مختصر کتاب "ایک اور مشرقی کتب خانہ" کے عنوان سے شائع کی۔ اس میں بھی اکثر مخطوطات اور نادر کتابوں کا ذکر ہے۔

غرض اس طرح جس کتب خانے کا فیض سنہ ۱۸۹۹ء سے مسلسل ۵۵ سال تک جاری رہا، جس ذخیرے نے اہل دیسنہ کے علمی شوق کو اُبھارا، جس نے ان کے دل و دماغ روشن کئے، جس نے ان کی ثقافتی زندگی کی قدروں کو اُجاگر کیا، آخر اس انمول خزانے کو خود اہل دیسنہ ہی نے ۱۷ جولائی ۱۹۶۰ء کو یہ کہتے ہوئے دوسروں کے حوالے کر دیا: ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را ● تو دانی حساب کم و بیش را

باقی نام رہے اللہ کا!

---

[1] دیسنہ لائبریری کا اصلی نام کتب خانۃ الاصلاح ہے۔ اس کا انتظام انجمن الاصلاح دیسنہ کے ذمہ تھا۔

پبلشر نذر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا